سرسید، اقبال اور علی گڑھ

پروفیسر اصغر عبّاس

4/1085، سرسید نگر، سول لائن، علی گڑھ (یوپی)، موبائل: 9358209974

اقبال کے زادراہ میں ۱۸۹۸ء سے ان کے آخری ایام تک سرسید اور علی گڑھ کے گہرے آثار و نقوش ملتے ہیں۔ یہاں انہی روابط کی نشاندہی کی گئی ہے۔

برصغیر میں سائنٹفک ٹمپر اور افکار نو کے فروغ کے لیے سرسید نے ہندوستان کے کئی حصّوں کے علاوہ پنجاب کے چار سفر کیے تھے۔ حالی نے لکھا ہے کہ سرسید کے پنجاب کے پہلے ہی دورے میں اہالیان پنجاب ان کی آواز پر اس طرح دوڑے جیسے پیاسا پانی کی جانب، ان میں اقبال کے استاذ سید میر حسن بھی تھے۔ ۱۸۷۳ء میں ان سے سرسید کی یہ ملاقات دیرپا ثابت ہوئی۔ وہ کئی بار علی گڑھ آئے۔ علی گڑھ کالج کی رسم تنصیب میں بھی وہ شریک تھے۔ وہ تاحیات مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ سرسید کی تفسیر قرآن بھی اُن کے مطالعے میں رہتی تھی۔ سرسید کی مذہبی فکر سے ان کی ذہنی قربت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ سید میر حسن کے پاس قرآن شریف کا ایک ایسا نسخہ تھا جس کے ہر دو صفحے کے درمیان سفید کاغذ لگے ہوئے تھے اور ان پر میر حسن نے سرسید کی تفسیر کی عبارتیں لکھی ہوئی تھیں۔ روایات اقبال کے مصنف عبداللہ چغتائی کا بیان ہے کہ یہ قرآن شریف اب تک میر حسن کے خاندان میں محفوظ ہے۔ غلام رسول میر نے لکھا ہے کہ علمی اور فکری اعتبار سے سید میر حسن سرسید کے نورتنوں میں تھے۔

اقبال کے ذوق علم کی تربیت میں سید میر حسن کے حصّے کا اعتراف اقبال بار بار کرتے ہیں۔

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جب اقبال ولایت جا رہے تھے اثنائے سفر میں اپنے استاد کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وہ شمع بارگاہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

سید میر حسن کی توجہ سے ابتدا ہی سے سرسید اور علی گڑھ کی محبت اقبال کے دل میں نفوذ کر چکی تھی۔ ۲۷/ مارچ ۱۸۹۸ء کو جب سرسید نے رحلت فرمائی، ان دنوں اقبال لاء میں کالج کے طالب علم تھے انھیں سیال کوٹ سے میر حسن کا پیغام ملا کہ سرسید کی وفات اس دور کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ تم اس موقع پر تاریخ وفات کہو، میں بھی فکر کرتا ہوں۔ اقبال نے قرآن مبین کی سورۂ آل عمران کے اس جز سے تاریخ وفات نکالی جس میں حضرت عیسیٰ کے لیے رب العالمین کی خوشنودی کا اظہار فرمایا گیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہی موت دینے والا ہے اور وہی الزام اور بہتان تراشیوں سے پاک کرنے والا ہے۔ 'روزگار فقیر' کے مصنف نے لکھا ہے کہ اقبال نے اس آیت سے مادۂ تاریخ نکال کر سرسید کی شخصیت کا بڑا حسین اعتراف کیا ہے۔

اقبال کے دل پر سرسید کے کردار کی پاکیزگی ان کی دردمندی اُن کی بے خوفی اور جرأت کا کتنا اثر تھا اس کا اندازہ اقبال کی اس نظم سے ہوتا ہے جو ۱۹۰۲ء کے رسالے مخزن لاہور میں 'سید کی لوح تربت' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس نظم میں سرسید کی شخصیت کے اساسی پہلوؤں کی طرف بڑی خوبصورتی سے اشارہ کیا گیا ہے۔ 'شیخ عبدالقادر ایڈیٹر رسالہ مخزن میں لکھتے ہیں ''تخیل کے کانوں نے سرسید کے مزار سے وہ صدائے پر درد جس کی اس دل سے جو مرحوم کے پہلو میں تھا توقع ہو سکتی تھی۔ سرسید زندگی میں کئی حیثیتوں کا جامع تھا اس کی لوح تربت سے وہ کلمات نصیحت شیخ محمد اقبال کی طبع رسا نے اخذ کیے ہیں جو زندگی کے مختلف مشاغل کے جامع ہیں۔''

اقبال کے دل میں سرسید کی جو قدر و منزلت تھی اس کا اندازہ اس کتاب سے بھی ہوگا جو اقبال کی ملاقاتوں اور گفتگوؤں پر مبنی ہے جسے 'اقبال کے حضور' کے عنوان سے سید نذیر نیازی نے شائع کیا ہے جس میں جگہ جگہ سرسید کے فکر و عمل کا ذکر آتا ہے۔

اقبال کے تحت الشعور پر سرسید کتنے چھائے ہوئے تھے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اقبال جب سخت علیل تھے اور سارا علاج بے سود ہو رہا تھا، سرسید اقبال کے خواب میں آئے۔ اقبال ایک خط میں راس مسعود کو لکھتے ہیں:

''میں نے تمہارے دادا رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضور رسالت مآبؐ میں عرض کر۔ میں اسی وقت بیدار ہو گیا

اور کچھ شعر عرضداشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے۔ کل ساٹھ شعر ہوئے۔ لاہور آ کر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی سی نظم ہے، اگر کسی زیادہ بڑی مثنوی کا حصّہ ہو جائے تو خوب ہو۔ الحمدللہ اب ختم ہوگئی ہے۔ مجھ کو اس مثنوی کا گمان بھی نہ تھا۔ بہرحال اس کا نام ہوگا ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' ضرب کلیم کی طباعت کے بعد اس کی کتابت شروع ہوگی۔''

اقبال سیال کوٹ سے مزید تعلیم کے لیے جب گورنمنٹ کالج لاہور آئے تو یہاں ٹامس واکر آرنلڈ سے تلمذ حاصل ہوا۔ یہاں آنے سے پہلے ٹامس واکر آرنلڈ تقریباً دس برس تک علی گڑھ کالج میں رہ چکے تھے۔ انھوں نے سرسید کی فرمائش پر پریچنگ آف اسلام لکھی تھی۔ وہ تاحیات سرسید کے جادو کا شکار رہے۔ علی گڑھ کالج میں وہ علامہ شبلی کے رفیق کار رہے۔ ٹامس واکر آرنلڈ اقبال کے مربی اساتذہ میں تھے، اعلیٰ جستجو اور تلاش و تحقیق کے جدید مغربی طریقوں سے انھوں نے اپنے شاگرد کو روشناس کرایا تھا۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور اور لندن دونوں جگہ اقبال کے معاون و مددگار رہے۔ اقبال نے ۱۸۹۹ء میں گورنمنٹ کالج سے ایم۔اے کیا، اسی سال ٹامس آرنلڈ نے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کا عارضی طور پر جائزہ لیا اور میکلوڈ عربک ریڈر کی اسامی پر اقبال کا تقرر کر دیا۔ اس جگہ کے فرائض منصبی میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ درس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا کام بھی انجام دے گا۔ اسی منصبی تقاضے کے تحت اقبال نے ۱۹۰۳ء میں اپنی کتاب ''علم الاقتصاد'' تصنیف کی اور آرنلڈ کی سفارش پر اس کتاب کی زبان کی علامہ شبلی نے درست کی۔ یہ اردو نثر میں اقبال کی واحد تصنیف ہے جو ان کی زندگی میں شائع ہوئی۔ آرنلڈ کی تحریک پر اقبال جرمنی گئے۔ عطیہ فیضی اپنی ڈائری ۱۹/جون ۱۹۰۷ء میں لکھتی ہیں: پروفیسر آرنلڈ نے مجھے اور اقبال کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ اثنائے گفتگو میں پروفیسر آرنلڈ نے کہا کہ مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ جرمنی کے ایک مقام میں نایاب مخطوطات دریافت ہوئے ہیں.... اقبال میں تمھیں وہاں بھیجنے کا خیال کر رہا ہوں۔ انھوں نے ایک شاگرد رشید کی طرح سر تسلیم خم کر دیا، پروفیسر آرنلڈ کا اقبال بہت احترام کرتے تھے۔ وہ انھیں اے کلیم دروسینائے علم سے مخاطب کرتے ہیں۔

لاہور میں اقبال جن احباب کے درمیان فرصت کے اوقات گزارتے تھے ان میں محمد شاہ دین ہمایوں تھے۔ انھیں اسلامی فقہ میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ سرسید نے انھیں اپنے زمانے کی اہم تنظیم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ۲۶ سال کی عمر میں صدر نامزد کیا تھا۔ اقبال نے کہا ہے:

اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی
تیری چنگاری چراغ انجمن افروز تھی

شاہ دین ہمایوں نے انگریزی میں سرسید پر بڑی بصیرت افروز کتاب لکھی ہے۔

انگریزی اخبار ''پنجاب آبزرور'' کے ایڈیٹر اور رسالہ مخزن کے مدیر شیخ عبدالقادر تھے۔ سرسید کے پنجاب کے تیسرے سفر کے دوران ایک جلسہ میں علی گڑھ کالج کے پرنسپل تھیوڈور بک نے انگریزی میں تقریر کی۔ ان کی تقریر ختم ہوتے ہی اس کا اردو ترجمہ اتنی شستہ اردو میں شیخ عبدالقادر نے کیا کہ سرسید نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ لاہور میں شیخ صاحب کی خانقاہ علی گڑھ کے شیدائیوں کا مرکز تھی۔ اقبال کے ہم جلیسوں میں لاہور میں خوشی محمد ناظر تھے، ناٹک ساگر والے نور الٰہی محمد عمر تھے، حکیم احمد شجاع تھے جنھوں نے اقبال کے ساتھ پنجاب کی درسی کتابیں مرتب کیں۔ میاں محمد شفیع تھے جن کی کوششوں سے مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۲۰ء میں پاس ہوا تھا۔ ان سب کا علی گڑھ کالج حبیب تھا اور یہ اس کے نقیب اور ترجمان تھے۔ ان دوستوں کا اثر یہ ہوا کہ اقبال کا علی گڑھ سے قلبی تعلق تاحیات قائم رہا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جب اقبال لندن گئے۔ اس زمانے میں تمدن ہند اور تمدن عرب کے مترجم اور علی گڑھ تحریک کے رکن رکین سید علی بلگرامی لندن میں تھے۔ ان کا مکان علی گڑھ کالج اور دوسرے ہندوستانی طلبا کی تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز تھا یہاں اقبال آتے جاتے تھے۔ ۲۲/اپریل ۱۹۰۷ء کو عطیہ فیضی اپنی ڈائری میں لکھتی ہیں: ''آج اقبال مجھے لینے کے لیے آئے۔ میں ان کے اور شیخ عبدالقادر کے ہمراہ کیمبرج گئی....۱۲/بجے سید علی بلگرامی کے مکان پر پہنچ گئی پھر وہاں مشاہیر آتے جاتے رہے۔ وقت لطف سے کٹ گیا۔ لندن میں علی گڑھ کالج کے ممتاز پرنسپل تھیوڈور بک کی بیٹی مس بک سے اقبال کے مراسم تھے۔ عطیہ فیضی اپنی ڈائری یکم اپریل ۱۹۰۷ء میں لکھتی ہیں کہ ''مس بک نے مجھے یہ کہہ کر مدعو کیا ہے کہ اقبال آپ سے ملنے کی غرض سے کیمبرج سے آ رہے ہیں۔ علی گڑھ کالج کے سابق ہر دل عزیز پرنسپل تھیوڈور مارلیسن ان دنوں حکومت برطانیہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ تھے۔ اقبال سے ان کے تعلقات تھے۔ 'شاد و اقبال' مرتبہ محی الدین قادری میں اقبال مہاراجہ کشن پرشاد شاد کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''سر تھیوڈور مارلیسن سکریٹری آف اسٹیٹ کی درخواست ہے کہ میں ایک مضمون تاریخ پر لکھوں۔ یہ مضمون کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کی جو لکھی جا رہی ہے کا ایک باب ہوگا۔ سر تھیوڈور نے مجھ سے اصرار سے کہا ہے اور بہ سبب ان کی عنایات کے انکار نہیں کر سکتا۔''

اقبال کے انگلستان روانہ ہونے کے ایک برس بعد راس مسعود عازم ولایت ہوئے۔ یہیں ان کے تعلقات اقبال سے استوار ہوئے۔ دونوں کے ملنے کا مرکز میرا قیاس ہے کہ سید علی بلگرامی اور آرنلڈ کا گھر رہا ہوگا۔ جب راس مسعود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو اقبال کی دلچسپی علی گڑھ سے بڑھ گئی۔ والیٔ افغانستان کی دعوت پر جب راس مسعود کابل گئے تو وفد میں ان کے ساتھ ڈاکٹر ہادی حسن، سید سلیمان ندوی اور اقبال بھی تھے۔ رفتہ رفتہ راس مسعود اور اقبال قریب ہوتے گئے۔ اقبال نے جب اپنا وصیت نامہ مرتب

کیا تو راس مسعود کو اپنے بچوں کا متولی بنانا چاہا۔ اقبال نے ہندوستانی سیاست میں حصّہ لینے کا جب راس مسعود کو مشورہ دیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میں فروغ تعلیم کے مقصد کو بہت عزیز رکھتا ہوں۔ سیاست کے ساتھ علم و دانش ضروری ہے۔ دونوں کی دوستی یہاں تک بڑھی کہ اقبال نے راس مسعود کو اپنا دوسرا Self کہا۔ جب اقبال کی علالت نے طول پکڑا تو راس مسعود کے توسط سے والیٔ بھوپال نے جو علی گڑھ کے طالب علم تھے، اقبال کو مالی پریشانیوں سے بے نیاز کر دیا۔ انوار اقبال میں محمد دین تاثیر کے نام اقبال اپنے خط میں لکھتے ہیں:

''میں یہاں بھوپال میں بہ غرض علاج برقی مقیم ہوں اور اگست کے آخر تک علاج جاری رہے گا۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے نہایت دردمندی سے میرا علاج کرایا ہے۔ اس کے علاوہ جب ان کو سر راس مسعود سے معلوم ہوا کہ میں ایک کتاب 'مقدمۃ القرآن' لکھنا چاہتا ہوں تو اُس ارادے کی تکمیل کے لیے مجھے انھوں نے تاحیات پانچ سو روپے ماہوار کی لٹریری پنشن عطا فرمائی ہے، اپنے علاج کے لیے اقبال کئی بار بھوپال آئے اور راس مسعود کے مکان ریاض منزل میں قیام کیا۔ اقبال نے اعتراف کیا ہے کہ راس مسعود کے یہاں رہ کر انھیں ذہنی سکون اور قلبی آرام میسّر آتا ہے۔ اقبال بابائے اردو مولوی عبدالحق کو راس مسعود کی رحلت پر ایک خط میں لکھتے ہیں: ''مسعود مرحوم کا اخلاص اس کی دردمندی اور اس کا اخلاق جس میں اس کے باپ اور دادا دونوں کی جھلک نظر آتی تھی، اب ہندوستان میں یہ باتیں کہاں نظر آئیں گی۔''

علی گڑھ کالج سے اقبال کے روابط کا ہمیں پہلا نقش ۱۹۰۷ء میں ملتا ہے۔ یہ کالج جس زمانے میں معرض وجود میں آیا یہاں ان دنوں روایت جدیدیت مفاہمت، معیشت، سیاست اور لسانی فرقہ وارانہ فسادات کے مسائل بہت پیچیدہ ہو گئے تھے۔ اسی اثنا میں علی گڑھ کالج کی یونین کے نائب صدر تصدق احمد خاں شروانی نے گوپال کرشن گوکھلے کو جو سرِ ونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے بانی اور انڈین نیشنل کانگریس کے سرگرم فرد تھے۔ کالج کے انگریز اساتذہ کی عرضی کے خلاف کالج کی یونین میں مدعو کر لیا۔ انھیں دعوت دینے والوں میں عبدالرحمٰن سندھی، راجہ غلام حسین جو بعد میں انگریزی اخبار کامریڈ کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہوئے اور عبدالرحمٰن بجنوری بھی تھے۔ ان طلبا پر کالج کے انتظامیہ کا عتاب نازل ہوا۔ علی گڑھ کالج کے طلبا نے شورش بپا کر دی اور کالج کو بند کرنا پڑا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ پہلی انگریزوں کے خلاف سرکشی تھی جو علی گڑھ کالج کے طلبا نے شروع کی، لیکن ہندوستانی تاریخ کے صفحات اس اہم واقعہ کے ذکر سے خالی ہیں اور جہاں تک میری معلومات ہے اس موضوع پر علی گڑھ میں بھی کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ اس زمانہ میں اقبال کیمبرج میں تھے، وہیں سے انھوں نے طلبائے علی گڑھ کالج کے نام اپنے پیغام میں کہا کہ شمع سحر بجھتے بجھتے یہ پیغام دے گئی ہے کہ سوز اور جلن، ذوق اور شوق اور درد والم سے زندگی کی تپش قائم رہتی ہے اور اسی سے کامیابی اور کامرانی حاصل ہوتی ہے۔ یہاں ہمیشہ نامور رہنے کے لیے طلب اور سوز کی شرط لازم ہے (یہی پیغام ہمارے پہلے دانشور سرسید کا بھی تھا) اقبال نے یہ بھی کہا کہ ابھی شوق کو پختگی کا مقام حاصل نہیں ہوا ہے اور نشے کی کیفیت ابھی ادھوری ہے یعنی انھوں نے اپنے پیغام میں یہ کہا کہ ابھی انگریزوں کے خلاف شورش کا وقت نہیں آیا ہے۔''

ہمارے اوّلین دانشور سرسید کی وفات کے بعد برصغیر میں ان کی یونیورسٹی کے قیام کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے جدوجہد کا آغاز ہو گیا تھا اس تحریک میں اقبال دامے، درمے، قلمے، سخنے شریک رہے۔

۲۴ر فروری ۱۹۱۱ء کو آغا خاں کی قیادت میں مسلم یونیورسٹی کے قیام اور زرتعاون کی فراہمی کے لیے ایک وفد لاہور گیا۔ اہل لاہور نے اس کا زبردست خیر مقدم کیا۔ استقبال کرنے والوں میں اقبال بھی تھے۔ آغا خاں کی صدارت میں برکت علی ہال میں جلسہ میں اقبال نے یہ رباعی پڑھی تھی:

باہر ہوئے جاتے ہو کیوں جامے سے
پوچھو کسی پنڈت سے نہ علامے سے
میں تم کو بتاتا ہوں کہ یونیورسٹی کیا ہے
پتلون کی تکرار ہے پاجامے سے

اس سے قبل ۱۹ر فروری ۱۹۱۱ء کو اہالیان لاہور کے جلسے میں مسلم یونیورسٹی کے قیام، اس کی غرض وغایت کے بارے میں اقبال تقریر کر چکے تھے۔ مجوزہ مسلم یونیورسٹی فنڈ میں زرتعاون دینے کے لیے وہ مسلم یونیورسٹی کے دستور اور اس کے بائی لاز ترتیب دینے میں اقبال سر عبدالقادر آنریبل حسن امام جسٹس شاہ دین ہمایوں، سید کرامت حسین، سید وزیر حسن میاں فضلِ حسین اور سر شاہ سلیمان کے ساتھ شریک تھے۔

اقبال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تین شعبوں اردو، فارسی اور فلسفہ کے امتحان کے پرچوں کے اکثر ممتحن ہوتے تھے۔ وہ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء میں ایم اے فارسی کے تیسرے پرچے کے ممتحن تھے۔ وہ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۵ء میں بی اے آنرز اور ایم اے فلسفہ کے پانچویں پرچے کے ممتحن تھے۔ اس زمانے میں اردو فارسی اور عربی کے پرچوں کے سوالات انگریزی میں دینے کا دستور تھا۔ اقبال نے مروجہ ضابطوں کے مطابق پرچے انگریزی میں ترتیب دیے۔ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر نے شکوہ کیا ''کہ ہمیں یہ دیکھ کر بہت دُکھ ہوا کہ ہماری یونیورسٹی میں اردو کے ایم۔ اے اور آنرز کے سوالات انگریزی میں دیے گئے ہیں۔ یہ حرکت ان ذمہ دار ہستیوں سے سرزد ہوئی ہے جو اردو ادب کے چشم و چراغ ہیں۔''

اقبال علی گڑھ کے اردو، فارسی اور فلسفہ کے شعبوں کے ایک عرصہ تک ایکسٹرنل ممبر تھے۔ وہ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۵ء تک شعبۂ اردو کے اور ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۷ء میں شعبۂ فلسفہ کے، ۱۹۳۵ء میں شعبۂ فارسی کے ایکسٹرنل ممبر

تھے۔ وہ ۱۹۲۱ء سے تادم آخر مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے۔ ۱۹۳۴ء میں شعبۂ اردو میں رشید احمد صدیقی ریڈر مقرر ہوئے۔ سلیکشن کمیٹی میں اقبال بھی تھے۔ اقبال تین دفعہ علی گڑھ آئے۔ پہلی بار وہ ۹ر فروری ۱۹۱۱ء کو علی گڑھ کالج میں توسیعی خطبہ دینے آئے۔ اگرچہ ان کے توسیعی خطبہ کا عنوان ''سلطنت برطانیہ'' تھا، لیکن انھوں نے یہاں وہ لکچر دیا جس کا انگریزی میں عنوان Muslim Community تھا اور جسے بعد میں ظفر علی خاں نے ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' کے عنوان سے اردو کا جامہ پہنایا اور شائع ہوا۔ یہ توسیعی خطبہ علی گڑھ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی صدارت میں ہوا۔ لکچر کے اختتام اور حاضرین کے پیہم اصرار پر اقبال نے اپنا مشہور ترانہ اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا، اپنے مخصوص انداز میں سنایا۔ علی گڑھ کالج کے طلبا اور اساتذہ اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ ایک خوش الحان طالب علم کو کلکتہ ریکارڈ میں بھرنے کے لیے بھیجا گیا اور دی گراموفون کمپنی کلکتہ نے اسے مسلم یونیورسٹی ریکارڈ کے نام سے جاری کیا۔ اقبال کے اشعار کا یہ پہلا ریکارڈ تھا، بعد میں رفیق غزنوی نے اقبال کی غزلیں 'ہز ماسٹرس وائس' پر ۱۹۳۴ء میں ریکارڈ کرائیں۔

دوسری دفعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اقبال کو Reconstruction of Religious Thoughtsin Islam خطبات دینے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ یہاں انھوں نے چھ خطبات دیے۔ پہلے تین خطبات وہ مدارس، بنگلور اور حیدرآباد میں دے چکے تھے باقی تین خطبات انھوں نے پہلی بار علی گڑھ میں دیے۔ یہ چھ خطبات ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئے۔ بعد میں ان خطبات میں ایک اور خطبہ کا اقبال نے اضافہ کیا۔ ان خطبات کا انگریزی سے اردو ترجمہ سید نذیر نیازی نے کیا۔ یہ پہلی بار ۱۹۵۸ء میں تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے عنوان سے شائع ہوئے۔ اقبال کے یہ خطبات مذہب اور سائنس کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی سرسید کی روایت کی توسیع ہیں۔ چوٹی کے اقبال شناس آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ ''اقبال کی شاعری سے زیادہ ان کی فکر خطبات میں روشن ہے۔''

اقبال ۱۸ر نومبر ۱۹۲۹ء کو دوپہر میں عبداللہ چغتائی کے ہمراہ علی گڑھ پہنچے۔ علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبا نے ان کا زبردست خیر مقدم کیا۔ اتنی گلپوشی ہوئی کہ وہ پھولوں میں چھپ گئے۔ اسٹیشن سے وہ یونیورسٹی کی بگھی میں گھڑسوار دستے کے ساتھ یونیورسٹی آئے۔ ان کا قیام ڈاکٹر ظفر الحسن کے مکان پر تھا۔ وائس چانسلر راس مسعود بھوپال سے دوسرے دن آئے۔ راس مسعود، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر ظفر الحسن، ڈاکٹر بٹ، کرنل بشیر حسین زیدی نے اقبال کے اعزاز میں عشائیہ اور عصرانہ دیا۔ اقبال صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور رشید احمد صدیقی کی عیادت کو بھی گئے۔ اقبال ہفتہ بھر علی گڑھ میں رہے اور علمی دنیا کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ خطبات کے سلسلے میں پہلا جلسہ ۱۹ر نومبر ۱۹۲۹ء کو ساڑھے چھ بجے شام اسٹریچی ہال میں ڈاکٹر ظفر الحسن کی صدارت اور وائس چانسلر راس مسعود کے خیر مقدمی کلمات سے شروع ہوا۔ اقبال کے باقی پانچ خطبات کے سڈنسن یونین رامپور حامد ہال میں ہوئے۔ ۲۰ر نومبر ۱۹۲۹ء کو آٹھ بج کر پینتالیس منٹ پر اقبال کا روایتی شان سے استقبال ہوا۔ یونین کے سپاسنامہ کے جواب میں اقبال نے یہ بھی کہا۔ ''میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو صرف ماضی سے محبت کرتے ہیں۔ میں تو مستقبل کا معتقد ہوں، مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لیے ہے کہ میں حال کو سمجھوں'' اسی جلسہ میں انھیں یونین کا لائف ممبر بنایا گیا۔

اقبال تیسری مرتبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اسپیشل کانوکیشن میں شرکت کی غرض سے ۱۸ر دسمبر ۱۹۳۴ء کو علی گڑھ آئے۔ اقبال کو اعزازی ڈگری دینے کی تجویز ۱۹۲۴ء میں منظور ہو چکی تھی، لیکن علالت کے سبب ۱۹۲۴ء کے کنووکیشن میں وہ شریک نہ ہو سکے۔ اسی تجویز کو بحال رکھا گیا اور ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۴ء کو اسپیشل کنووکیشن میں اقبال اور سر راس مسعود کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری پیش کی گئی۔ کنووکیشن ایڈریس سر شاہ سلیمان نے پڑھا۔

اقبال نے حمایت اسلام کے جلسوں میں نظمیں پڑھنے کا آغاز ۱۹۰۰ء میں کر دیا تھا، لیکن ان کی ہندوستان گیر شہرت کا باعث علی گڑھ کے طلبا اور اساتذہ ہیں۔ مشہور خطیب عطاء اللہ شاہ بخاری جب علی گڑھ آنے لگے تو ان کے احباب نے کہا کہ اگر علی گڑھ کے مسلمانوں کو خطاب کرنا ہے تو شہر کی جامع مسجد میں تقریر کرنا اور اگر سارے برصغیر کو مخاطب کرنا ہے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے یونین ہال میں تقریر کرنا۔ اقبال کا کلام اور ان کی فکر شروع سے علی گڑھ کی یونین کا موضوع گفتگو رہا ہے۔ یہاں کے طلبا اور اساتذہ کی اکثریت ان کے فکر و فن کی گرویدہ رہی ہے۔ یہاں کے وائس چانسلر سر راس مسعود کو اقبال کے اتنے اشعار حفظ تھے کہ خود اقبال کو نہیں تھے۔ ہمارے زمانے میں علی گڑھ کے مایہ ناز اور برگزیدہ وائس چانسلر سید حامد کا دل بھی اقبال کے فکر و فن نے موہ لیا تھا جس کی مثال اُن کے اقبال پر انگریزی اور اردو مضامین کے علاوہ یونیورسٹی میں علامہ اقبال ہال کی تعمیر بھی ہے۔ ادبی دنیا میں اقبال کا سب سے پہلا تعارف ۱۹۰۳ء میں سید سجاد حیدر یلدرم کے اقبال پر مضمون ''اردو کا نیا شاعر اقبال'' سے ہوتا ہے۔ نقش اقبال کے مطابق خواجہ غلام السیدین کی عالمانہ انگریزی تصنیف پہلی کتاب تھی جس نے اقبال کو مغرب سے روشناس کیا۔ علی گڑھ سے اتنے اقبال شناس پیدا ہوئے ہیں جس کی دوسری مثال برصغیر میں نہیں ہے۔

۱۹۳۵ء میں جب اقبال علیل ہوئے تو ممنون حسن خاں لکھتے ہیں کہ دریافت صحت کے لیے سب سے زیادہ خطوط علی گڑھ کے اساتذہ اور طلبا کے ہوتے تھے۔ ''۱۹۳۸ء میں جب اقبال کا انتقال ہوا تو ''علی گڑھ کے لیے یہ سانحہ ایک گہرے ذاتی صدمے کا باعث ہوا۔ ان کی موت نے آناً فاناً یونیورسٹی سے اس کی تمام رونقیں اور قہقہے چھین لیے۔'' ○○